سے نو مہینے قبل کی یادگار ہے۔ علامہ نے کہا ''عربوں کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی ہے وہ ہر مسلمان کے لئے باعث اضطراب اور رنج ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانان جہان کو ایک موقع فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے وہ اس امر کا پوری قدرت سے اعلان کریں کہ مسئلہ فلسطین جسے برطانوی حکومت یہودیوں کے حق میں حل کرنا چاہتی ہے وہ محض مسئلہ فلسطین نہیں بلکہ اسلامی مسئلہ ہے جس کا شدید اثر تمام تر دنیائے اسلام پر ہوگا۔ فلسطین سے یہودیوں کا جبری اخراج کبھی بھی نہیں ہوا بلکہ بقول یہودی محقق پروفیسر ہوکنگ ''یہود اپنی مرضی سے اس ملک فلسطین سے باہر نکل گئے اور ان کے مقدس صحائف کا غالب حصہ فلسطین سے باہر ہی مرتب و مدون ہوا''۔ علامہ نے یہ بتایا کہ یورپ پہلے کمزور ممالک کو ظلم و ناانصافی کا نشانہ بناتا ہے اور پھر اس کے غم میں مگرمچھ کے آنسو بہا کر ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ علامہ نے فرمایا ''فلسطین میں یہود کے لئے ایک قومی وطن کا قیام تو محض حیلہ ہے حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ میں مستقل انتداب اور سیادت کی شکل میں اپنے لئے ایک مقام کی تلاش میں ہے''۔

چنانچہ علامہ نے یورپ اور خصوصی طور پر برطانیہ کی اس سازش پر اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے ہر ملت مظلوم کا یورپ ہے خریدار
جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکان جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

علامہ اقبال نے قائداعظم محمد علی جناح کو لکھا کہ "۱۵/اکتوبر ۱۹۳۷ء کو لکھنو میں منعقد ہونے والے مسلم لیگ کے سالانہ جلسہ میں فلسطین کی حمایت میں قرارداد منظور کی جائے اسی خط میں لکھتے ہیں مسئلہ فلسطین مسلمانوں کے ذہن کو بہت متاثر کر رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس جلسہ میں نہ صرف ایک قرارداد پاس کی جائے بلکہ مسئلہ فلسطین پر ایک عظیم کانفرس برصغیر میں منعقد کریں تاکہ مسلماناں ہند سے فلسطین کے مسئلہ کو فائدہ پہنچے۔ ذاتی طور پر میں ایسے مقصد کے لئے جیل جانے کے لئے بھی تیار ہوں۔ مشرق کے دروازے پر ایک مغربی مرکز بہت خطرناک ہے''۔

علامہ اقبال نے فلسطین کے سفر کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا ''سفر فلسطین میرے زندگی کا

دلچسپ واقعہ ثابت ہوا۔ فلسطین کے زمانہ قیام میں متعدد اسلامی ممالک مثلاً مراکش، مصر، یمن، شام، عراق اور جاوا کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی۔ شام کے نوجوانوں سے مل کر خاص طور پر متاثر ہوا"۔

علامہ ہی کی دعوت اور ان کے اصرار پر مفتی اعظم فلسطین سید حسینی ہندوستان آئے چنانچہ عطیہ فیضی کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قیام بمبئی میں بوہیر پیشوا سیدنا سیف الدین کے پاس رہا اور اس سفر جو مئی ۱۹۳۳ء میں ہوا علامہ نے مفتی اعظم کی مالی عنایت بھی کی۔

علامہ کے انتقال کے (۳۶) سال بعد مفتی فلسطین پاکستان آئے اور علامہ اقبال کی قدردانی کی اور ان کے جذبات کو فلسطینی تنظیم کی روح قرار دیا۔

مولانا گرامی اور علامہ اقبال

مولانا غلام قادر گرامی ۱۸۵۶ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۷ء کو ہوشیار پور کے قبرستان کندن شاہ بخاری میں دفن ہوئے۔ غلام قادر گرامی فارسی کے بڑے عالم اور مشہور شاعر تھے۔ مولانا گرامی علامہ اقبال کے خاص دوستوں میں تھے۔ واقعات اور مراسلات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ گرامی اور اقبال کے تعلقات ۱۹۰۲ء سے گرامی کی رحلت ۱۹۲۷ء تک برقرار رہے۔ علامہ کی گرامی سے ملاقات انجمن حمایت اسلام کے جلسات سے شروع ہوئی اگرچہ علامہ کا پہلا خط گرامی کے نام ۱۱ر مارچ ۱۹۱۵ء اور آخری خط ۳۱ر جنوری ۱۹۲۷ء کا ہے۔ علامہ اقبال کے تقریباً (۹۰) خطوط گرامی کے نام ہیں۔ جن سے بے تکلفی، شوخی، مسائل خانگی، مقدمات دیوانی، بیماری اور نجی گفتگو کے ساتھ ساتھ فلسفہ، تصوف، فارسی شاعری پر بحث و مباحثہ کے علاوہ اقبال کی شاعری پر گرامی کی تنقید، تفسیر اور تعریف کے حوالوں کا پتہ ملتا ہے۔ غلام قادر گرامی محلہ کی مسجد میں قرآن پڑھنے کے بعد خلیفہ ابراہیم کے مکتب میں شریک ہوئے جہاں فارسی کے متداول درسی کتابیں، بوستان، گلستان اور سکندر نامہ پڑھیں۔ استطاعت شعری دیکھ کر خلیفہ ابراہیم نے ان کی ہمت افزائی کی چناں چہ بقول خود ابھی میری عمر آٹھ سال سے زیادہ نہ تھی کہ خلیفہ ابراہیم نے مجھے ملک الشعراء کے خطاب سے مخاطب کیا چناں چہ ابتدائی دور مشق میں مجھے انتہائی مقام کا عنوان حاصل ہو گیا۔ گرامی مکتب کی تعلیم حاصل کر کے لاہور آئے اور اورینٹل کالج لاہور میں فارسی ادبیات میں منشی عالم اور منشی فاضل پاس کیا پھر وکالت کا امتحان پاس کیا لیکن کبھی وکالت نہیں کی بلکہ تدریس اور معلمی کو اپنا پیشہ بنایا چناں چہ امرتسر، کپورتھلہ اور لدھیانہ میں فارسی مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر محکمہ پولیس میں سارجنٹ رہے اور جلد ہی اس سے فراغت حاصل کی اور چار سال تک نواب فتح علی خان قزلباش کے اتالیق رہے۔ پھر گرامی کے دل میں دکن جانے کی خواہش پیدا ہوئی چناں چہ میجر حسن بلگرامی کی وساطت اور مولانا محمد حسین آزاد کی سفارش سے حیدرآباد پہنچے اور حضور نظام نواب محبوب علی خان کی شان میں قصیدہ ''گرامی بہ حضور آید'' پیش کر کے ''شاعر خاص'' دربار مقرر ہوئے۔ محمد حسین آزاد نے اپنے خط میں گرامی کو اوّل درجہ کا شاعر کہا تھا اور

جلال اسیرؔ، قاسمؔ مشہدی اور ظہوریؔ کی طرز کا شاعر نامزد کیا تھا۔ مولانا گرامیؔ ۱۸۸۹ء سے ۱۹۱۷ء یعنی (۲۸) سال حیدرآباد میں مقیم رہے اور انھیں وہاں ملک الشعرا کا خطاب بھی دیا گیا۔ اگرچہ گرامیؔ کی ماہوار معقول تھی لیکن ان کی فضول خرچیاں ہمیشہ ان کو تنگ دست رکھتی تھیں۔ چناں چہ ایک بار نظام کی خدمت میں گلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے شہنشاہ آفتاب ضمیر — چہ دہم شرح بے پروبالی
طبع من پست شد چو ہمت من — از تہی دستی و کہن سالی
شاعر شاہم و چنین مفلس — نقلِ ہر محفلم ز نقالی
با گرامیؔ دوکم دو صد دہند — قدرؔ را بودہ چار صد حالی

علامہ اقبالؔ ہمیشہ گرامیؔ کی فکر و شاعری کے دلدادہ تھے چناں چہ اپنے خط ۹ر فروری ۱۹۲۲ء میں لکھتے ہیں۔ ''گرامیؔ جہانگیری بہار کا آخری پھول ہے جو ذرا دیر سے شاخ سے پھوٹا۔ افسوس آج خان خاناں نہ ہوئے کہ ان کو معلوم ہوتا خاک پنجاب، شیراز اور نیشاپور سے کسی طرح کم نہیں''۔

گرامیؔ فطرتاً بڑے سست اور نازک مزاج تھے۔ خطوط کے جواب اور مسافرت سے کتراتے تھے وعدے کرتے لیکن بہت کم نبھاتے چناں چہ علامہ کے اکثر خطوط انہی مسائل کے متعلق طنز و شکوہ کے خوبصورت نمونے ہیں۔ گرامیؔ نے کبھی اپنا کلام جمع کرنے کی فکر نہ کی۔ علامہ نے اس طرف توجہ دلائی لیکن ان کی زندگی میں کبھی یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا چنان چہ گرامیؔ کے انتقال کے بعد ان کی رباعیات اور غزلیات کے دیوان جدا جدا طور پر شائع کئے گئے۔ گرامیؔ کو ان کی بیگم اقبال بیگم سے کوئی اولاد نہ ہوئی جس کی حسرت انھیں ایسی رہی کہ ہمیشہ خود کو ''نخل بے ثمر'' کہا کرتے تھے۔ اور اس ضمن میں ایک مثنوی نالہ گرامیؔ در حسرت جوانی ان کے دیوان میں موجود ہے۔ گرامیؔ بڑے خوش ذوق اور سیدھے سادہ فقیر منش آدمی تھے۔ ان کے واقعات پر لطف اور شوخ ہیں، جن میں ایک دو کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔ زندہ رود میں جسٹس جاوید اقبالؔ لکھتے ہیں کہ جب کبھی گرامیؔ لاہور آتے تو علامہ اقبالؔ کے پاس قیام کرتے۔ ایک دفعہ کئی ہفتہ لاہور میں طولانی قیام ہو گیا چناں چہ ان کی بیگم نے اُن کو

بلوانے کے لئے بیماری کا بہانہ کر کے ٹیلگرام بھیجا۔ ٹیلگرام دیکھ کر گرامی ہوشیار پور جانے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ رات کے نو بجے تھے اور اس وقت کوئی گاڑی ہوشیار پور کو نہیں جاتی تھی چنان چہ گرامی کا اصرار اور تشویش دیکھ کر علامہ اقبال نے کہا کہ ابھی آپ کو بھجواتے ہیں پھر کہا کہ مولانا رباعی کے تین مصرع ہوئے ہیں اور چوتھا مصرعہ لگائے۔ مصرعوں کو سُن کر گرامی بیٹھ گئے اور مصرع لگانے لگے لیکن کوئی مصرعہ اقبال کو پسند نہ آیا اقبال اوپر جا کر سو گئے۔ تقریباً صبح تین بجے گرامی نے علامہ کے خادم علی بخش کو بھیج کر اقبال کو جگایا اور پھر کہا کہ اچھا مصرعہ لگ گیا تھا تو سونچا کیوں صبح تک انتظار کیا جائے۔ پھر اقبال سے سنگترے منگوانے کی خواہش کی چناں چہ علامہ نے علی بخش کو بھیج کر ۳ بجے صبح میوہ فروش کو جگا کر سنگترے منگوائے اور گرامی نے اُسے بڑے شوق سے کھایا۔ اس طرح تمام رات گذری لیکن گرامی کو ان کی بیگم کی علالت اور ٹیلگرام کی یاد نہ آئی۔ چنانچہ صبح ہونے پر علامہ نے انھیں ہوشیار پور روانہ کیا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نظام حیدر آباد کے دربار میں گرامی نے ایک خوب صورت غزل سُنائی جس سے متاثر ہو کر نظام نے انھیں کچھ اور سُنانے کا حکم دیا۔ گرامی نے قصیدہ اور چند غزلیں سُنا کر معذرت چاہی لیکن نظام نے مزید سُنانے کو کہا تو گرامی نے بے ساختہ پنجابی میں کہا۔ ''چھڈ یار ہُن میں تھک گیاں''۔

ایک بار گرامی نے دربار نظام میں دلکش غزل سُنائی تو نظام نے دو سیر سونا انعام کے طور پر عطا کیا۔ اس غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

آں پری گر از چمن گرم عتاب آید بیروں — بلبل از گل، گل ز بو، بو از گلاب آید بروں

یار گر آید بروں نا خوردہ مئے از میکدہ — مست از مستی و مستی از شراب آید بروں

تو بہ چشم ام آمدی من گریہ سر کردم بلے — آفتاب آید بہ چشم ام از دیدہ آب آید بروں

ترجمہ۔ اگر وہ پری چہرہ عتاب کے ساتھ چمن کے باہر نکلے تو بلبل پھول سے، پھول خوشبو سے اور خوشبو گلاب سے باہر نکل جائے گی۔ اگر یار شراب پیئے بغیر میکدہ سے نکلے تو مست سے مستی اور مستی شراب سے باہر نکل جائے گی۔ جب تو میری آنکھوں میں سما گیا تو میں رونے لگا جیسا کہ آنکھوں میں سورج

آجانے سے آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

گرامی کے شاگرد عزیز الدین عظامی نے تاریخ وفات لکھی ''غالب پنجاب مرد '' (۱۳۴۵ ہجری)

علامہ اقبال نے اس دیرینہ اور ہمدرد دوست کے غم پر جو اشعار لکھے اس کا ایک شعر ان کی خاطرات کا مجموعہ بن کر یوں ظاہر ہوا۔

؎ یادایامی کے باتو گفتگو ہا داشتم

اے خوشا حرفی کہ گوید آشنا بہ آشنا

مولانا ندوی سے علامہ نے کیا دریافت کیا؟

غلام قادر گرامی کے بعد علامہ نے جس شخصیت سے سب سے زیادہ استفادہ کیا وہ مولانا سید سلیمان ندوی تھے جن کے نام علامہ کے (۶۰) ساٹھ سے زیادہ خطوط ہیں۔ مولانا سے علامہ کے دیرینہ تعلقات تھے۔ مولانا ندوی اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ افغانستان کے وفد میں شامل ہو کر افغانستان بھی گئے تھے۔ علامہ مولانا سے اکثر دینی اور بعض وقت ادبی مسائل میں رجوع کرتے تھے۔ اگرچہ ان خطوط اور مطالب کا مکمل ریویو ممکن نہیں لیکن کچھ خطوط کے انتخاب سے ہمارے مدعا کی تائید ہوتی ہے کہ سلیمان ندوی سے استفادہ بھی ادبی اور عالمانہ مباحث سے تعلق رکھتا تھا۔ علامہ اقبال ۲۸/ اپریل کو سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔ ''رموز بے خودی'' آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ ریویو کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفیض ہوگا''۔ ۱۵/ مئی ۱۹۱۸ کو لکھتے ہیں۔ ''صحت الفاظ اور محاورات کے متعلق جو آپ نے لکھا ہے ضرور صحیح ہوگا۔ اگر آپ نے غلط الفاظ اور محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے اُن سے آگاہ کیجیے۔ دوسرے ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو جائے گی۔ اس تکلیف کو میں ایک احسان تصور کروں گا''۔ علامہ ۱۳/ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں۔ ''قوافی کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا بالکل بجا ہے مگر چونکہ شاعری اس مثنوی (اسرار خودی) سے مقصود نہ تھی اس واسطے میں نے بعض باتوں پر عموماً تساہل برتا۔ اس کے علاوہ مولانا روم کی مثنوی میں قریباً ہر صفحہ پر اس قسم کی قوافی کی مثالیں ملتی ہیں۔ اصول تشبیہ کے متعلق کاش آپ سے زبانی گفتگو ہو سکتی۔ قوت واہمہ کے عمل کے رو سے بیدل اور غنی کا طریق زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ''قطرہ از نرگس شہلاستی'' یہ جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے میں نہیں سمجھ سکا۔ کیا آپ کا یہ مقصود ہے قطرہ کا لفظ شہلا کے لئے موضوع نہیں۔ جیسے فرصت ملے جزئیات سے بھی آگاہ فرمائے''۔

۲۳/ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے مکتوب میں سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں ''سیر'' فارسی میں ان معنوں میں آتا ہے۔ ''سیر کردن'' ''سیر زدن'' ''سیر داشتن'' بلکہ سیر دیدن۔

عمر یا صائبؔ بہ شہر عقل بودم کوچہ بند　　مدتی ہم با غزلان سیر صحرا می زنم

(ترجمہ۔اے صائبؔ ایک عمر میں شہر عقل کے کوچوں میں بند رہا اور مدت سے غزالوں کے ساتھ صحرا کی سیر کر رہا ہوں)۔لفظ ''نعرہ'' حیوانات کی آواز کے لئے بھی آتا ہے۔اس وقت نعرۂ اسد کی سند موجود ہے اور مجھے یاد ہے شیر کے لئے بھی مستعمل ہوا ہے۔دشت اور بیشہ مرادف بھی آتے ہیں اور دشت کے لئے ضروری نہیں کہ بالکل خشک ہو۔

مپرس از آب و رنگ کوہسارش ہزاران دشت لالہ داغدارش

(ترجمہ۔اس کوہسار کا آب ورنگ نہ پوچھ ہزاروں لالہ صحرا اس سے داغ بردل ہیں)

۳۰/اکتوبر کے مکتوب میں ندوی کو لکھتے ہیں۔ ؎ازگل غربت زمان گم کردۂ۔

آپ کا ارشاد اس مصرع پر یہ تھا کہ ''ازگل'' بہ معنی بدولت اچھے معنوں میں آتا ہے۔بُرے معنوں میں نہیں آتا۔بہار عجم میں زیر لفظ ''گل'' یہ محاورہ بھی دیا ہے اور اشعار بھی دیے ہیں۔

ع۔زیر دست چرغ بودن ازگل بے فطرتی است

۳/اپریل ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں ''میری خامیوں سے مجھے ضرور آگاہ کیجئے۔آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن مجھے فائدہ ہوگا۔''بادہ نارسا'' کے لئے مجھے کوئی سند یاد نہیں۔بادہ نارس یا میوہ نارس لکھتے ہیں۔لفظ ''مینار'' غلط ہے۔صحیح لفظ ''منار'' ہے۔یہ لفظ اُس زمانے کی نظموں میں واقع ہوئے ہیں جس زمانے میں میں سمجھتا تھا کہ لٹریچر میں ہر طرح کی آزادی لے سکتے ہیں۔یہاں تک کہ بعض نظموں میں میں نے اصول بحر کا بھی خیال نہیں کیا اور ''ارادۂ''۔

۱۵/اکتوبر ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں۔''شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمع نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔اس بات کہ مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں اُن کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصوّر نہ کریں اس واسطے کے آرٹ (فن) غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجود حالات میں میرے لئے ممکن نہیں۔جرمنی کے دو بڑے شاعر بیرسٹر تھے یعنی گویٹے اور اوہلنڈ۔گویٹے تھوڑے دن پریکٹس کر کے ویمر کی ریاست کا تعلیمی مشیر بن گیا اور اس

طرح فن کی باریکیوں کی طرف توجہ دینے کا اُسے پورا موقع مل گیا اوبلنڈ تمام عمر مقدمات پر بحث کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑی نظمیں لکھ سکا اور وہ کمال پورے طور پر نشو نما نہ پا سکا جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اگر احباب تبصرہ پر مصر ہیں تو یہی بہتر ہے کہ مجموعہ کا انتظار کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا''۔

۲۰/اپریل ۱۹۲۲ء کو سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔ ''مرزا غالبؔ کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے''۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود رحمۃ للعالمین ہم بود

حال کے ہیت دان کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی ممکن ہے اگر ایسا ہو تو رحمت للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے۔ اس صورت میں کم از کم محمدیتؐ کے لئے تناسخ یا بروز لازم آتا ہے۔ ۲۹/مئی ۱۹۲۲ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''خضر راہ کے متعلق جو نوٹ آپ نے لکھا اس کا شکریہ قبول فرمائے۔ جوش بیان کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا صحیح ہے مگر یہ نقص اس نظم کے لئے ضروری تھا۔ اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دئے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوش بیان بہت بڑھا ہوا ہے اور جناب خضر کے انداز طبیعت سے موافقیت نہیں رکھتا تھا۔ یہ بند اب کسی اور نظم کا حصہ بن جائیں گے''۔ یکم فروری ۱۹۲۴ء کو سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔ ''میں آپ کا نہایت شکر گذار ہوں گا اگر آپ از راہ عنایت اپنے وسیع معلومات سے مجھے مستفیض فرمائیں۔ کم از کم ان کتابوں کے نام تحریر فرمائے جن کو پڑھنا ضروری ہے''۔ علامہ ادبی مسائل ہی نہیں بلکہ مذہبی مسائل بھی مولانا سے دریافت کرتے تھے چناں چہ ۲۷/اگست ۱۹۲۴ء کو لکھتے ہیں۔ ''اگر صحابہ کے اجماع نے کوئی حکم نص قرآنی کے خلاف نافذ کیا تو علامہ آمدی کے خیال کے مطابق ایسا کسی ناسخ حکم کی بنا پر ہوا ہے۔ وہ ناسخ حکم سوائے حدیث نبویؐ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ناسخ قرآن ہو سکتی ہے جس سے کم از کم مجھے تو انکار ہے اور غالباً آپ کو بھی ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ دوبارہ زحمت دینے پر مجبور ہوا''۔

علامہ اقبالؔ کے خطبات زمان اور مکان پر بہت مقبول ہوئے انہی مضامین کے بارے میں ۷/ مارچ اور ۱۸ مارچ ۱۹۲۸ء کو لکھتے ہیں۔ ''شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں۔ ان میں ایک قول یہ ہے کہ خدا زمان ہے۔ بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے۔ کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلمبند فرما کر مجھے ارسال فرمادیں۔ میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا صرف خلاصہ چاہتا ہوں جن کے لکھنے سے غالباً آپ کا بہت سا وقت ضائع نہ ہوگا''۔ ان خطوط کے پانچ سال بعد ۸/ اگست ۱۹۳۳ء میں سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔ ''حضرت محی الدین ابن عربیؔ کے فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث کس کس جگہ ہے۔ حوالے مطلوب ہیں۔ حضرات صوفیہ میں اگر کسی اور بزرگ نے اس مضمون پر بحث کی ہو تو اس کے حوالے سے بھی آگاہ فرمائیے''۔

۲۳/ اگست ۱۹۳۳ء کو لکھتے ہیں۔ ''جتنی آگاہی آپ نے دے دی ہے وہ اگر زمانہ فرصت دے تو باقی عمر کے لئے کافی ہے۔ زمان و مکان و حرکت کی بحث اس وقت فلسفہ اور سائنس کے مباحث میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ میری ایک مدت سے خواہش ہے کہ اسلامی حکما و صوفیہ کے نقطہ نگاہ سے یورپ کو روشناس کرایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا بہت اچھا اثر ہوگا۔ میرے لکچر آکسفورڈ یونیورسٹی چھاپ رہی ہے۔ اُردو ترجمہ نیازی صاحب نے ختم کرلیا ہے۔ اس کی طباعت بھی عنقریب شروع ہوگی''۔

علامہ اقبالؔ کے خطوط کی روشنی میں یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ نے مولانا ندوی سے بھی ادبی اور زیادہ تر تاریخی و مذہبی معلومات میں استفادہ کیا۔

کیا داغؔ دہلوی کے سوا علامہ کسی اور کے شاگرد رہے!

علامہ اقبالؔ کس کے شاگرد رہے اور کن کن شخصیتوں سے شعروشاعری میں استفادہ کیا دو جداگانہ اور غور طلب مسائل ہیں۔ اقبالیات کے طالب علم اس امر سے بخوبی واقف ہیں کے علامہ نے اپنی فکر اور علم کی وسعت کے لئے، اپنے اشعار کی نوک و پلک سنوارنے، اپنی زبان کی صحت اور فن شاعری کی باریکیوں سے واقف ہونے کے واسطے اُس زمانے کے منتخب جید عالموں سے فیض حاصل کیا لیکن سوائے داغؔ دہلوی کسی اور کو اپنا استاد نامزد نہیں کیا۔ علامہ اقبالؔ کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ وہ اپنی پینتالیس (۴۵) سالہ شعری زندگی میں گلشن ادب کے گل چین بنے رہے چناں چہ تمام زندگی حُسن اور محاسن ادب کی تلاش میں مصروف رہے۔ علامہ اقبالؔ کی ایک غزل سب سے پہلے ۱۸۹۳ء میں مجلّہ ''زبان'' دہلی میں شائع ہوئی تھی۔ پروفیسر حمید احمد خان مدیر مجلّہ زبان نے اس غزل کے ساتھ اقبالؔ کو شاگرد بلبل ہند داغؔ دہلوی لکھا تھا چناں چہ اقبالؔ کو داغؔ دہلوی سے شرف تلمیذی کم از کم ۱۸۹۳ء سے رہا ہوگا۔ جہاں تک داغؔ کا تعلق ہے اقبالؔ نے نہ صرف اس کا اظہار بلکہ فخر بھی کیا ہے۔ فروری ۱۸۹۶ء میں ایک بیس (۲۰) اشعار پر مشتمل نظم مجلّہ ''شور محشر'' کے ڈسمبر کے شمارے میں شائع کی اور مقطع میں داغؔ کی شاگردی پر یوں فخر کیا۔

نسیم و تشنہؔ ہی اقبالؔ کچھ نازاں نہیں اُس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغؔ سخنداں کا

اگر چہ ۱۸۹۷ء میں جب داغؔ نے یہ لکھ بھیجا کہ ''اب تمھارے کلام کو اصلاح کی ضرورت نہیں'' یہ سلسلۂ شاگردی ختم ہوا لیکن اقبالؔ کے دل میں داغؔ کی عزّت اور حرمت آخری عمر تک باقی رہی۔ داغؔ کی وفات پر اقبالؔ کی چوبیس (۲۴) اشعار پر مشتمل نظم حقیقت میں ان کے جذبات کا مرثیہ ہے۔

آج لیکن ہم نوا سارا چمن ماتم میں ہے
شمع روشن بجھ گئی بزم سخن ماتم میں ہے

چل بسا داغؔ آہ میت اُس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

سری رام نے ''خمخانۂ جاوید'' میں لکھا ہے کہ اقبالؔ شروع بچپن سے شعر اور استعداد شعر گوئی رکھتے تھے۔

انھوں نے اپنی مادری زبان پنجابی میں شاعری شروع کی اگرچہ آج وہ نمونے محفوظ نہیں۔ بعد میں شمس العلماء میر حسن کی رہنمائی میں اُردو میں شعر کہنے لگے۔ میر حسن کی ہی ہدایت پر علامہ نے داغؔ سے رشتہ تلمیذ برقرار کیا۔ علامہ خود کو شمس العلما کی زندہ تصنیف کہا کرتے تھے اور اُن سے مسلسل استفادہ کرتے رہے لیکن جہاں تک فن شاعری میں استاد اور شاگرد کے رشتے کی بات تھی وہ داغؔ ہی تک محدود رہی۔

''شعر اقبالؔ'' میں عابد علی عابدؔ نے لکھا ہے کہ اقبالؔ نے ارشدؔ گورگانی کو اپنا ابتدائی کلام دکھایا ہے لیکن دوسرے محققین نے اس بات کی تصدیق نہیں کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہزادہ ارشدؔ گورگانی اقبالؔ کے مدّاح تھے چناں چہ لاہور کے ایک مشاعرے میں جب اقبالؔ نے یہ خوبصورت شعر پڑھا۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

تو آپ تعریف کر کے کہنے لگے اقبالؔ! اس عمر میں یہ شعر!!

علامہ اقبالؔ کے حبیب الرحمان خان شیروانی کے نام ۱۹۰۳ء مارچ سے اگست کے درمیان تین خطوط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شیروانی صاحب نے کچھ اشعار پر اصلاح دی تھی جس پر اقبالؔ نے لکھا۔ ''آج مجھے اپنے ٹوٹے پھوٹے اشعار کی داد مل گئی۔ بعض جگہ جو تنقید آپ نے فرمائی ہے بالکل درست ہے بالخصوص لفظ ''چبھ'' کے متعلق مجھے آپ سے کلّی اتفاق ہے کیوں کہ یہ بات میرے خیال میں مطلق نہ تھی۔ آپ لوگ نہ ہوں تو واللہ ہم شعر کہنا ہی ترک کر دیں''۔

پھر مئی ۱۹۰۳ء کے خط میں لکھتے ہیں آپ کا خط حفاظت سے صندوق میں بند کر دیا ہے۔ نظر ثانی کے وقت آپ کی تنقیدوں سے فائدہ اٹھاوں گا۔ اگر میری ہر نظم کے متعلق آپ اس قسم کا خط لکھ دیا کریں تو آپ کا نہایت ممنون ہوں گا"۔

علامہ اقبالؔ نے اکبرؔ الہ آبادی، خواجہ حسن نظامیؔ، مولانا سلیمان ندوی اور غلام قادر گرامیؔ سے فن شاعری میں مباحثہ، مشورہ اور استفادہ کیا لیکن کسی کو بھی اپنا استادِ سخن نہیں کہا۔ علامہ اقبالؔ اکبرؔ الہ آبادی کو اپنا پیر و مرشد تصوّر کرتے تھے اور تہ دل سے اُن کی عزت و احترام کے قائل تھے۔ ''مکاتیب اکبرؔ''

کے ترتیب کار مرزا سلطان احمد کے دیباچہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبالؔ کے پاس اکبرؔ کے کئی خطوط موجود تھے لیکن افسوس کے وہ خطوط شائع نہ ہو سکے۔ اس وقت ادب کے دامن میں صرف اکبرؔ کے پانچ خطوط بنام اقبالؔ موجود ہیں جن میں سے دو خط ''اقبالؔ نامہ'' اور تین خطوط اقبالؔ کے انتقال کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّہ ''راوی'' کے خصوصی ''اقبالؔ نمبر'' میں شائع ہوئے تھے۔ البتہ اقبالؔ نے جو اکبرؔ کے نام خطوط لکھے اُن میں سے سولہ (۱۶) خطوط شیخ عطاءاللہ کے مرتب کردہ ''مجموعۂ خطوط اقبالؔ'' میں شامل ہیں۔ علامہ ۱۸/اکتوبر ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں ''آپ کے خطوط سے مجھے نہایت فائدہ ہوتا ہے اور مزید غور و فکر کی راہ کھلتی ہے اسی واسطے میں ان خطوط کو محفوظ رکھتا ہوں کہ یہ تحریریں نہایت بیش قیمت ہیں اور بہت لوگوں کو اُن سے فائدہ پہنچنے کی امید ہے''۔

۱۱/دسمبر ۱۹۱۴ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

؎ جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

سبحان اللہ۔ کس قدر باریک اور گہرا شعر ہے۔ آپ نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ میں بند کر دیا۔

اقبالؔ ۲۰/اپریل ۱۹۱۹ء کے خط میں اکبرؔ کو لکھتے ہیں ''چند روز ہوئے ایک مصرع ذہن میں آیا تھا۔ دوسرا مصرع نہیں ہو سکا۔ ؎ این سر خلیل است با آذر نتوان گفت
غور فرمائے۔ کچھ ذہن میں آئے تو مطلع کیجئے''۔

۱۶/جولائی ۱۹۱۴ء کے خط میں اکبرؔ الہ آبادی کو لکھتے ہیں ''اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ اقبالؔ پوچ گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہوگا کیوں کہ شاعری سے میرا مقصد حصول دولت و جاہ نہیں محض اظہار عقیدت ہے''۔

اقبالؔ اور اکبرؔ کی ملاقاتیں اور نامہ نگاریاں دراصل دو عظیم مفکروں، دو اسلامی فلاسفروں اور دو عظیم شاعروں کی انجمن آرائیاں معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھتے اور ایک دوسرے کے اشعار کی داد دیتے اور لیتے ہوئے سرشار اور خوش نظر آتے ہیں۔ اکبرؔ اپنے خط ۲۷/اکتوبر ۱۹۱۱ء میں لکھتے

ہیں۔'' آپ کی نظم سوز میں نے پڑھی۔ ماشاء اللہ چشم بدور۔ اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو چشم بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اس عمر میں بلا تجربہ دنیا آپ کے دل کی نظر کم سے کم اخلاقی حقایق کی طرف ہے۔

؎ کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر

کس قدر بلیغ وصحیح ولبریز معنی ہے۔ اگر چہ یہ لطیف وخوبصورت وبلیغ ترکیب الفاظ آپ کی علمی قابلیت اور خاص شاعرانہ سلیقہ کا لہجہ ہے"۔ علامہ کے خطوط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ انگلستان کے قیام کے دوران خواجہ حسن نظامی کی نثر نگاری اور صحت زبان پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ اگر میں خواجہ نظامی کی طرح نثر لکھنے کا ہنر رکھتا تو ہرگز شاعری کو اپنے اظہار کا وسیلہ نہیں بناتا۔ حسن نظامی کے قول کے مطابق اقبال کی مثنوی ''اسرار خودی'' کا نام خود خواجہ نظامی نے تجویز کیا تھا اگر چہ زندہ رود میں جسٹس جاوید اقبال نے لکھا کہ مثنوی کا نام خود اقبال نے منتخب کیا۔ اسرار خودی پر قلمی جنگ سے قبل علامہ اقبال نے ۱۶ر فبروری ۱۹۱۶ء کو لکھا ''وہ مثنوی جو حقیقت واستحکام پر بحث ہے اب قریباً تیار ہے اور پریس جانے کو ہے اس لئے کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمائے۔ شیخ عبدالقادر نے اس کے نام اسرار حیات پیام سروش، پیام نو اور آئین نو تجویز کئے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمائے اور نتائج سے مطلع کیجئے تا کہ میں انتخاب کرسکوں''۔

مولانا گرامی علامہ کے استاد کیوں نہیں؟

غلام قادر گرامی کی زندگی میں ''رسالہ شمع'' کے ایڈیٹر جناب حسن عابد جعفری نے ۱۹۲۵ء کے شمارے میں مولانا گرامی کی ایک فارسی غزل پر تعارفی نوٹ میں لکھا کہ علامہ اقبال گرامی کے شاگرد ہیں۔ اس پر علامہ نے اُسی وقت ایڈیٹر کو خط لکھا کہ وہ گرامی کے شاگرد نہیں اور اس طرح موقتی طور پر یہ مسئلہ خاموش تو ہو گیا لیکن کئی اذھان میں حل نہ ہو سکا۔ اس مضمون میں اسی موضوع پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

اُردو اور فارسی شاعری میں استاد کا احترام اور شاگرد کی اطاعت لازم و ملزوم نظر آتی ہے۔ چناں چہ ادب کے دامن میں کئی ایسی روایتیں موجود ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بعض شعرا اپنا کلام اس وقت تک کسی کو نہیں سُناتے تھے جب تک کہ ان کے استاد اس کی اجازت دے دیں۔ اغلب شعرا اُستاد کی اصلاح اور تنقید کو حرف آخر تصوّر کرتے اور استاد کے رنگ میں شعر کہنے کو اپنی کامیابی سمجھتے۔ استاد کا ذکر عوام میں بغیر کسی جھجک بلکہ فخریہ انداز میں کرتے خصوصاً اگر استاد صاحب معرفت اور شہرت ہوتا۔ مرزا غالب کے شاگردوں کے نام سے کون واقف نہیں۔ علامہ اقبال داغ دہلوی کی شاگردی پر فخر کرتے تھے اور مشہور ہے کہ داغ دہلوی بھی علامہ اقبال کا ذکر خاص انداز میں کرتے تھے۔

علامہ اقبال کے تقریباً (۱۴۵۰) خطوط موجود ہیں جن کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے مولوی میر حسن، اکبر الہ آبادی، حبیب خان شیروانی، سید سلیمان ندوی اور غلام قادر گرامی سے استفادہ ضرور کیا تھا لیکن وہ رشتہ' تلمیذ جو داغ کے ساتھ مخصوص تھا کسی اور کے ساتھ نہ تھا۔ مولانا گرامی کے ساتھ علامہ اقبال کا طریقہ' کار جداگانہ تھا جو عام استاد اور شاگردی رشتے سے بالکل مختلف تھا۔ خطوط کے مطالعہ سے جو حقائق سامنے آئے ان کو سہولت کی خاطر یوں پیش کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اقبال نے عام طور سے چیدہ چیدہ اشعار پر نشان دہی کر کے اصلاح یا رائے حاصل کی۔

۲۔ اگر اصلاح پسند آئی اُسے بہ شکریہ قبول کیا ورنہ اُس پر توجہ نہ کی۔

۳۔ بعض مقامات پر اصلاح یا تنقید پر اعتراضات بھی کئے اور اس کے جواز میں معتبر حوالے پیش کئے۔

۴۔ بعض اوقات خود مولانا گرامی کے اشعار پر تنقید کی اور اُس کو بہتر طور پر پیش کیا۔

۵۔خطوط میں ادبی مشورے کے علاوہ بے تکلفی ،شوخی،طنز ومزاح ،نجی گفتگو،مقدمات دیوانی، بیماری کے ساتھ ساتھ فلسفہ،تصوّف ،فارسی شاعری پر بحث ومباحثہ کے علاوہ تنقید،تفسیر اور تعریف کے حوالے شامل ہیں جو عموماً استاد اور شاگرد کی اصلاح کے مراسلات میں نظر نہیں آتے۔

۶۔علامہ مولانا گرامی سے عمر میں اکیس (۲۱) سال چھوٹے تھے لیکن ۱۹۰۳ء سے یار آنہ اور بے تکلفی اس حد تک تھی کہ انھیں مولانا نومی، بابا گرامی اور گونا گوں القاب سے یاد کرتے جو استاد شاگرد شریعت میں روا نہیں۔

۷۔علامہ بعض اوقات مصرع طرح دیتے اور اُس پر غزل لکھنے کی تاکید کرتے چناں چہ دیوان گرامی میں ایسی غزلیات زیادہ ہیں۔

۸۔جو شعر اچھا کہیں مل جاتا اُسے گرامی کے خط میں لکھتے اور صحت زبان،فن کی باریکیوں اور مسائل تصوف وفلسفہ پر بحث ومباحثہ کرتے۔

۹۔علامہ اقبال گرامی کی بڑی قدر کرتے اور ہر لحظہ ان سے استفادہ کر کے اپنے اشعار کے نوک و پلک سنوارتے رہتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ شعر گوئی کا خاص مزا اور طبع ماحول پر منحصر ہے۔

۱۰۔گرامی بھی اقبال کو اپنے سے عظیم شاعر تسلیم کرتے تھے چناں چہ اپنے ایک خط میں خان نیاز خان کو لکھتے ہیں۔''ڈاکٹر اقبال مجدّد ہیں،فلاسفر ہیں،ادب رموز ہند ہیں۔گرامی ان کا سا دماغ کہاں سے لائے۔دو تین شعر کہتا ہوں۔ڈاکٹر صاحب کی خدمت عالی میں بھیج دیجئے۔ان کی داد سمیٹے دوسروں کی دادعین بے داد''۔

۱۱۔اسی لئے جب ۱۹۲۵ء میں ایڈیٹر رسالہ شمع نے علامہ اقبال کو مولانا گرامی کا شاگرد لکھا تو اقبال اور گرامی دونوں نے اس اطلاع کی تردید کی۔

اگرچہ علامہ اقبال کے تقریباً (۹۰) نوّے خطوط ان بیان کی گئی باتوں پر دلیل ہیں لیکن ہم صرف چند ضروری اقتسابات پیش کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ علامہ بے شک گلشن گرامی کے گل چین تھے لیکن وہ ان کے شاگرد نہ تھے۔

مولانا گرامی کا پہلا ذکر علامہ اقبال کے خط مورخہ ۱۱/ مارچ ۱۹۰۳ء میں ملتا ہے جن دنوں مولانا اقبال کے پاس سکونت کرتے تھے۔ ۱۹۱۵ کے خط میں علامہ اقبال لکھتے ہیں۔ ''بابا گرامی سلام۔ دو خطوں کے جواب آپ کے ذمے ہیں۔ آپ کس غفلت میں قیام پذیر یا تشریف فرما ہیں۔ جواب لکھئے اور جلد اشعار کے متعلق میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دیجئے''۔

۳/ ستمبر ۱۹۱۲ء کے خط میں اقبال لکھتے ہیں۔ ''آپ کا تخلص گرامی کی جگہ نومی ہونا چاہیے تھا کیوں کہ آپ سوتے بہت ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ روان لنکا کے بادشاہ کی طرح آپ چھ ماہ سوتے اور چھ ماہ جاگتے ہیں۔ ۴/ دسمبر ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں فارسی ادب کی چند نہایت عمدہ نظم ونثر کی کتابوں کے نام تجویز فرمائے جو آپ کے نزدیک نہایت عمدہ ہیں۔ اس خط کو نہایت ضروری تصور کریں''۔

۱۳/ جولائی ۱۹۱۴ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''مولانا گرامی آپ کہاں ہیں۔ حیدرآباد میں ہیں یا عدم آباد میں۔ اگر عدم آباد میں ہیں تو مجھے اطلاع دیجئے تا کہ آپ کو تعزیت نامہ لکھوں۔ صدیاں گزر گئیں کہیں آپ کا کلام دیکھنے میں نہیں آیا۔ کبھی کبھی چند اشعار بھیج دیا کرو تو کون سی بڑی بات ہے۔ میری شاعری گھٹ کر اب اسی قدر رہ گئی ہے کہ اوروں کے اشعار پڑھ لوں۔ گزشتہ سال ایک مثنوی فارسی لکھنی شروع کی تھی ہنوز ختم نہیں ہوئی۔ خدارا جلد آئے۔ سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ آ کر میری مثنوی سُنیے اور اس میں مشورہ دیجئے۔ امید ہے کہ بابا گرامی اچھا ہوگا اور نئے نکاح کی فکر میں اپنے آپ کو نہ گھلاتا ہوگا''۔

۲۸/ جنوری ۱۹۱۵ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''غزل پڑھ کر نہایت مسرت ہوئی۔

ع۔ بہ دست عقل دہند از شکست توبہ کلید

نے پہروں بے قرار رکھا۔ سبحان اللہ۔ آج ہندوستان میں کون ہے جو یہ ترک لکھ سکتا ہے۔ گرامی معجز نگار ہندوستان کے لئے سرمایہ ناز ہے۔ آج ایران میں بھی ایسا سحر طراز نہ ہوگا۔ زندہ باش اے پیر کہن۔ ہاں چند شعر اور لکھتا ہوں۔ اس خیال سے نہیں کہ اپنے اشعار سُناوں بلکہ اس خیال سے کہ شاید آپ کو تحریک ہو اور آپ سے نیے اشعار سنوں''۔ ۱۸ جنوری ۱۹۱۵ء کو لکھتے ہیں۔

''مثنوی ختم ہوگئی ہے۔ آپ آئیں تو آپ کو دکھا کر اس کی اشاعت کا اہتمام کروں مگر فبروری مارچ تو محض وعدۂ معشوقانہ معلوم ہوتا ہے۔ گرامی سے حیدرآباد نہیں چھوٹ سکتا۔ کاش میں خود حیدرآباد پہنچ سکوں مگر یہ بات اپنے بس کی نہیں۔ اُردو اشعار لکھنے سے دل برداشتہ ہوتا جاتا ہوں۔ فارسی کی طرف زیادہ میلان ہوتا جاتا ہے اور وجہ یہ ہے کہ دل کا بخار اُردو میں نکال نہیں سکتا۔ چند اشعار عرض کرتا ہوں''۔ علامہ نے پھر چھ اشعار لکھے جو پیام مشرق میں شامل ہیں۔ صرف تیسرا شعر حذف کر دیا گیا ہے۔ پھر علامہ پانچ مہینوں کے بعد ۵ رمئی ۱۹۱۵ء کو لکھتے ہیں۔ ''مثنوی ختم ہوگئی اب اس کی اشاعت کا اہتمام درپیش ہے۔ چھپ جانے پر انشاء اللہ ارسال خدمت کروں گا۔ کاش آپ یہاں ہوتے یا میں حیدرآباد میں ہوتا تو پریس میں جانے سے پہلے آپ کے ملاحظہ سے گذر جاتی۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ حیدرآباد تو دور ہے لکھنو جا کر خواجہ عزیز کو سناؤں لیکن لاہور کے علایق نہیں چھوڑتے''۔

۱۸ رڈسمبر ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''مندرجہ زمین میں غزل بھی لکھ لائیے۔ انکار نہ ہو ورنہ ہمارا آپ کا کوئی یارانہ نہیں۔ ؎ خوش آں کہ رخت خرد از شعلۂ می سوخت''

علامہ اقبال بعض اصلاحات یا تنقیدات کو قبول نہیں کرتے تھے چناں چہ فبروری ۱۹۱۷ء کو لکھتے ہیں۔ ''درس از سیماب گیرد زندگی'' لاجواب مصرع ہے۔ مگر اس مقام کے لئے موزوں نہیں۔ یہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ حقیقی زندگی یہ ہے کہ انسان اپنی راہ کی رکاوٹوں پر غالب آئے۔ یعنی بہ الفاظ دیگر زندگی کی کُنہ استیلا ہے میں نے اس شعر کی جگہ مندرجہ ذیل شعر لکھا ہے۔ آپ کا مجوزہ مصرع کسی اور جگہ کام دے گا۔

زندگانی سوختن سوزیدن است خویش را بر سبک رہ دوزیدن است

اس شعر کو ملاحظہ فرمائیے اور اپنی رائے سے آگاہ کیجئے''۔

۱۹ رفبروری ۱۹۱۷ء کو علامہ گرامی کو لکھتے ہیں۔ ''آج کل حضرت حسینؓ کے واقعہ شہادت کا تاریخی مفہوم نظم کر رہا ہوں۔ اس میں ضمناً چند شعر عقل اور عشق پر ہیں جو عرض کرتا ہوں''۔ اس کے بعد اقبال چند شعر لکھتے ہیں۔

مولانا گرامی کی ایک خوبصورت غزل ملنے پر علامہ اقبال نے ۲۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو لکھا کہ ''سبحان اللہ کیسی دل آویز غزل ہے۔ ایک ایک شعر پر دل تڑپتا ہے۔ کس کس کی داد دوں۔ اگر آپ اس طرح کلام ارسال فرماتے رہیں تو میں تھوڑے عرصے میں آپ کا مجموعہ تیار کر کے دنیا کے سامنے اس بیش بہا خزانے کو پیش کر دوں گا۔ اس زمانہ انحطاط میں کسی مسلمان کا ایسا کلام ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قوم میں زندگی کی قوتیں ابھی باقی ہیں''۔

مولانا گرامی اقبال کو جواب میں لکھتے ہیں۔ ''ڈاکٹر صاحب تسلیم۔

ہست این مے کدہ و دعوت عام است این جا　　قسمت بادہ با ندازۂ جام ست این جا

سبحان اللہ۔ کیا شعر ہے۔ مصرع ثانی جواب نہیں رکھتا۔ دعوت عام دلیل اثبات۔

حرف آن راز کہ بیگانہ زصوت است ہنوز　　ازلب جام چکیدست وکلام است این جا

واہ واہ۔ راز کو حرف اور صوت کا لباس پہنا دو تو وہ کلام ہو جاتا ہے اور کلام کی تعریف بھی یہ ہے کہ وہ حرف اور صوت سے مرکب ہو۔

دوش در بت کدہ مستانہ در آمد اقبال　　گردش چشم تبان گردش جام است این جا

اقبال کی ایک اور غزل عرفی کی غزل کا جواب ہے بلکہ بڑھ کر۔

ایک غزل خدمت میں بھیجا ہوں۔ غور سے اس غزل کو دیکھیں اور لکھیں''۔

اقبال نے پھر ۲ر ڈسمبر ۱۹۱۸ء کو لکھا۔ ''غزل کیا ہے دفتر معرفت ہے۔ یہ غزل کئی دفعہ آپ سے سُن کر مزے لے چکا ہوں۔ آج قند مکرر کا مزہ دے گئی۔ فلسفہ حال کے بعض حقائق اس اشعار میں ایسی خوبی سے نظم ہوئے ہیں کہ اگر ان حقائق کو مغربی معلم سُنیں تو پھڑک جائیں۔ اس جگر کاوی کا اندازہ لوگ نہیں لگا سکتے۔ ان کے سامنے شعر بنا بنایا آتا ہے وہ اس روحانی اور لطیف کرب سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ جہاں اچھا شعر دیکھو سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی مسیح مصلوب ہوا ہے۔ اچھے خیال کا پیدا کرنا اوروں کے لئے کفارہ ہوتا ہے۔ مجھے میرا مصرعہ ابھی تک کھٹکتا ہے۔ طبیعت حاضر ہو تو پھر غور کروں گا''۔

علامہ اقبال ۱۶ر فبروری ۱۹۱۹ء کو لکھتے ہیں۔ مصرع ''این سر خلیل است'' حاضر ہے تصرف بے جا کی

کون سی بات ہے۔ آپ کا مال ہے مگر آپ نے جو مصراع لگائیں ہیں قلب کو تسکین نہیں ہوئی۔ قلب کچھ اور مانگتا ہے اور معلوم نہیں کیا۔ غزل پوری کر کے ارسال فرمائے۔

باسوختگاں قصہ زکوثر نتواں گفت۔ خوب مصرع ہے۔ اقبالؔ بھی غزل ضرور لکھے گا۔ مگر گرامیؔ کی حلاوت کہاں سے لائے گا۔ عجیب وغریب مضامین خیال میں آرہے ہیں لیکن ان کی تکمیل کے لئے فرصت اور وقت کہاں سے آئے گا''۔

۱۶/مارچ ۱۹۱۹ء۔ کیا خوب گرامیؔ تو اقبالؔ کو پورا سال ٹالتا رہا اور اقبالؔ ایک ہی خط میں آجائے۔ پہلے آپ لاہور تشریف لائیں پھر اقبالؔ بھی جالندھر آئے گا۔ آپ کی غزل لاجواب ہے۔

؎ عشوہ مفروش کہ محمود غلام است اینجا۔ لِلّٰہ درک۔ گرامیؔ خود بڈھا مگر اس کا فن جوان ہے۔'' آفتاب لب بام'' بھی خوب نکلا لیکن خام ابھی باقی ہے۔ اس پر ضرور لکھیئے۔ اقبالؔ نے گرامی کے جن اشعار کی داد دی وہ دیوان گرامیؔ میں اس طرح ہیں۔

با دل شدگان قصہ زمحشر نتواں گفت　　باسوختگاں حرف زکوثر نتواں گفت
آں رمز جلیل است ابو جہل چہ فہمید　　آں سرّ خلیل است بآذر نتواں گفت
دردیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبالؔ　　پیغمبری کرد و پیغمبر نتواں گفت

(ترجمہ۔ دل باختہ لوگوں سے حشر کا قصہ نہ کہا جائے۔ جو جلے ہوئے ہوں اُن سے حوض کوثر کا ذکر نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک بڑا راز ہے اسکو ابوجہل کیا سمجھے گا۔ وہ حضرت ابراہیمؑ کا راز ہے اُسے آذر سے بیاں نہیں کیا جاسکتا۔ معنی پر نگاہ رکھنے والوں کی نظر میں حضرت اقبالؔ نے پیغمبری کی ہے مگر ان کو پیغمبر نہیں کہا جاسکتا۔)

علامہ جولائی ۱۹۲۰ء کے خط میں لکھتے ہیں۔'' بھلا یہ شعر کیسا ہے۔

کم نہ شود خزانہ ملت بے بہا نیست　　یک دو نفس زیادہ کن غنچہ نیم بازرا

مقصود یہ ہے کہ ترے پاس وقت کا لازوال خزانہ ہے پھر غنچہ کی عمر تھوڑی سی زیادہ کردے تو اس میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ بہ نظر انتقاد ملاحظہ کیجئے۔ مولوی میر حسن کی خدمت میں بھی یہ شعر سیالکوٹ لکھا ہے

دیکھیں ان کی رائے کیا ہے؟ (نوٹ۔ یہ شعر اقبالؔ کے کلام میں شامل نہیں)

علامہ جولائی ۱۹۱۹ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''آپ کو معلوم ہوگا یہ عرفیؔ کی غزل ہے جو مجھے کمزور نظر آئی ہے اس لئے اس پر غزل لکھنے کی جرات ہوئی ورنہ عرفیؔ کی غزل پر غزل لکھنا گرامیؔ کا کام ہے نہ اقبالؔ کا''۔ علامہ اقبالؔ گرامیؔ سے فلسفہ اور تصوف پر بھی بحث اور مباحثہ کرتے تھے چناں چہ ۱۹۲۰ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''شاہ نعمت اللہ کرمانی کا مشہور قصیدہ ''حالت روزگار می بینم'' دیکھنے کے قابل ہے۔ ہندوستان میں جو اس کے مروّج ہیں بہت غلط ہیں۔ پروفیسر براؤن نے جو نسخہ شائع کیا بہت صحیح ہے''۔

علامہ اقبالؔ کے دو اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے گرامیؔ لکھتے ہیں۔ ''گرامیؔ نے اقبالؔ کو دیکھ لیا مگر ایک حسرت رہی وہ یہ کہ ہائی کورٹ کی ججی پر جلوہ افروز نہیں دیکھا۔ ہاں قلم روئی معافی میں گورنر کی کرسی پر جلوہ فرما دیکھتا ہوں اور یہی عہدہ جلیلہ ہے۔ فرمایئے الہام کا کیا حال ہے۔ وہ غزل پوری ہوئی پوری ہوگئی ہوگی مگر گرامیؔ اس قابل نہیں کہ اس کو وہ الہام آمیز کلام بھیجا جائے۔

زستیز آشنایاں چہ نیاز وناز خیزد دلکے بہانہ سوزی نگہی بہانہ سازی

(ترجمہ۔ جو جنگ کے خواہشمند ہیں ان سے ناز و نیاز کیا ہوگا۔ ایک بہانہ دل اور ایک بہانہ ساز نگاہ)

یہاں پہلے مصرع کو دوسرے مصرع سے کوئی ربط نہیں۔ المعنی فی البطن شاعر یوں چاہیے۔

دوشرارہ درکشا کش دو حریف در ستیزہ دلکے بہانہ سوزی نگہای بہانہ سازی

یہ غزل پیام مشرق میں موجود ہے چناں چہ اقبالؔ نے گرامیؔ کی اصلاح قبول نہ کی اور شعر جس طرح سے پہلے اقبالؔ نے لکھا تھا اُسی طرح باقی رہا۔

۳۱/مارچ ۱۹۲۱ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''مگر بحیثیت مجموعی آپ کا (گرامیؔ کا) مصرع کھٹکتا ہے۔ براہ تست مرارشتۂ امید دراز۔ بھلا اگر یوں لکھے تو کیا ہو۔

زفیض مژدہ لطف تو روز عیش دراز زعہد وعدہ وصل تو عمر غم کوتاہ

(ترجمہ۔ تمھارے لطف کی خوش خبری کے فیض سے روز عیش دراز ہے اور تمھارے وعدہ وصل کے عہد میں غم کی عمر کوتاہ ہوگی)۔

۳۰ر ڈسمبر ۱۹۲۱ء کو گرامی کو لکھتے ہیں۔ ''کل ایک غزل کے چند اشعار آپ کی خدمت میں لکھے تھے ان میں سے ایک شعر یہ تھا''۔

زمن نوائے بلندے مجو کہ دردِ چمنم ہنوز زمزمہ پست است وخندہ زیر لبی است

گذشتہ رات چارپائی پر لیٹا تو طبیعت پھر اس شعر کی طرف عود کر آئی۔ اس ہیولیٰ سے یہ صورت پیدا ہوئی

غزل بہ زمزمہ خواں پردہ پست تر گرداں ہنوز نالۂ مرغان نوائے زیر لبی است

رہ عراق وخراسان زن اے مقام شناس۔ یہ شعر غزل سے نکال دیا ہے۔ عراق، خراسان مقام ہندوستان میں کون سمجھے گا۔ جو اشعار آپ کو ناپسند ہے کاٹ دیجئے''۔

پھر علامہ ۵ر جنوری ۱۹۲۲ء کے خط میں گرامی کو لکھتے ہیں۔ ''آپ نے اس غزل کے اشعار پسند فرمائے مجھے تو آپ کے شعر نے تڑپا دیا۔

کتاب عقل ورق ورق فروخواندیم تمام حیلہ فروشی ومدعا طلبی است

آپ کا شعر پڑھتے ہی میری آنکھوں سے اس زور کے ساتھ آنسو امڈے کہ ضبط نہ ہو سکا۔ مضمون میرے حسب حال تھا۔ تمام عمر کتابوں کی ورق گردانی میں گزری اور آخر یہ معلوم ہوا کہ کتاب حیلہ فروشی اور مدعا طلبی کے سوا کچھ نہ نہیں۔ آپ کے ایک ایک مصرع میں سو سو بوتل کا نشہ ہے اسی واسطے تو گرامی پیر مغاں ہے''۔ خدا جانے زندگی کب تک ہے کچھ عرصے کے لئے آجائے تاکہ میں بھی آپ کی صحبت سے مستفیض ہو جاؤں۔ یہ صحبتیں کسی زمانے میں تاریخ کے ورق بن جائیں گی۔ ہاں اس غزل کا آخری شعر بھی لکھ دوں۔

مسخ معنی من درعیار ہند و عجم کہ اصل ایں گہر از گریہ ہای نیم شبی است

بندگی باہمہ جبروت خدائی مفروش۔ اس کی اصلاح کیجئے۔ لفظ ''ہمہ'' کھٹکتا ہے۔ اگر آپ کے خیال میں ''ہمہ'' لفظ قابل اعتراض نہیں تو پھر پہلا مصرع لکھ دوں گا۔

جب گرامی کا نام لے کر خان نیاز الدین خان نے نظم خضر راہ پر اعتراض کیا تو اقبال نے ۲۴ رمئی ۱۹۲۲ء کو گرامی کو لکھا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ اقبال کے نزدیک آپ کا فرمودہ وحی والہام ہے نہ کسی اور کا۔ بلکہ آپ کے خط سے تو میرے خیال کی تائید ہوئی۔ میں نے آپ کو لکھا بھی تھا کہ یہ اعتراض آپ کا نہیں ہوسکتا۔ سننے والے کی غلطی ہوگی سو ایسا ہی ثابت ہوا۔ اگر کوئی شخص دنیا میں ایسا موجود ہے جس کو گرامی کی نیت اور نیک نفسی میں شبہ ہے تو وہ اقبال کے نزدیک کافر ہے۔ میں تو آپ کو ولی سمجھتا ہوں آپ کس خیال میں ہیں''۔

علامہ اقبال ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔ ''اللہ اللہ کیا خوب غزل لکھی ہے'' کہ در پردہ با پردہ در ساختم'' امید کہ غزل ختم ہوگئی ہوگی۔ باقی اشعار بھی ضرور روانہ فرمائے۔ نظری کا ایک شعر نظر سے گذرا۔

؎ کسی کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

ساری غزل ہی خوب ہے۔ معلوم نہیں کبھی آپ نے بھی اس پر غزل لکھی یا نہیں۔ ایک شعر میرے ذہن میں بھی آ گیا۔

برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است — حدیث خلوتیاں جز بہ رمز وایمانیت

۲۸ راکتوبر ۱۹۲۳ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''اس شعر

زندانی کہ بند زپایش کشادہ اند — آہی گذاشت است کہ بو نام دادہ اند

مولوی اسلم جراج پوری کا اعتراض ہے کہ'' گذاشت است'' ذوق سلیم کو کھٹکتا ہے۔ مجھ کو ان کی ایراد میں صداقت ضرور معلوم ہوتی ہے لیکن گرامی کا فتویٰ قطعی ہوگا۔ آپ اپنی صحیح رائے سے مطلع فرمائیں۔ اس شعر پر تنقیدی نظر ڈالے اور نتیجہ سے آگاہ کیجئے''۔

علامہ اقبال کا آخری خط گرامی کے نام ان کی وفات سے چار مہینے قبل کا یعنی ۳۱ رجنوری ۱۹۲۷ء کا ہے۔ جس میں علامہ لکھتے ہیں۔ ''ڈاکٹر محمد حسین صاحب سے آپ کی علالت کا ذکر میں نے کیا تھا۔ وہ آپ کے علاج کے لئے تیار ہیں۔ لہذا امید ہے کہ اپنے علاج کی خاطر اور نیز مشتاقان زیارت کے خیال سے ضرور لاہور آئیے۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ دیرینہ ہم خیالوں کی صحبت میں جو دم گذر جائے

غنیمت ہے۔ اس کے علاوہ یہ عرض ہے کہ میری کتاب زبور عجم ختم ہوگئی ہے۔ اس کے چار حصّے ہیں کل مجموعہ کا نام زبور عجم ہے۔ آپ ہر حصّہ کا کوئی موزوں اور مناسب نام تجویز کریں تو عنایت ہو"۔

علامہ اقبال اور مولانا گرامی میں بے تکلفی اور شوخی آخری ملاقات تک برقرار رہی۔ چناں چہ ۱۵ر جنوری ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں۔ "علی بخش حاضر ہوتا ہے میں پہلے ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ آپ اتنے عرصے خضاب کر لیں ورنہ لاہور میں آ کر کر لیجئے گا۔ میں نے مہندی اور دسمہ آپ کے لئے منگوا رکھا ہے"۔

۲۰ر جنوری ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں۔ "غزل کے چند شعر آپ کے تشریف لے جانے کے بعد ہو گئے تھے۔ شاید کچھ اور بھی ہو جائیں۔ آپ یہاں تھے تو تحریک تھی۔ آپ کے جانے سے وہ تحریک غزل خوانی بھی افسردہ ہو کر مر گئی۔ اقبال آپ کا پیر نہیں گرامی پیر اقبال ہے"۔

علامہ ۶ر فروری ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں۔ "غزل تنقید کے لئے ہی تو آپ کی خدمت میں ارسال کی تھی اس پر خوب تنقید کیجئے اور مفصل تحریر فرمائے۔ پھر میں انشاءاللہ نظر ثانی کروں گا"۔

علامہ اقبال سطحی تنقید کے قائل نہ تھے چناں چہ ۹ر فروری ۱۹۲۲ء کو گرامی کو لکھتے ہیں۔ "مہربانی کر کے غزل کے تمام اشعار پر اعتراض لکھیے تا کہ میں پورے طور پر مستفید ہو سکوں۔ آپ نے صرف ایک شعر کی تعریف کر دی اور باقی اشعار چھوڑ گئے۔ میں چاہتا ہوں اُن پر اعتراض کیجئے۔ آپ کے کسی شعر میں اگر کوئی بات مجھے کھٹکے تو میں بلا تکلف عرض کر دیتا ہوں۔ آپ کیوں ایسا نہیں کرتے مجھے تو تعریف سے اس قدر خوشی نہیں ہوتی جس قدر اعتراض سے کیوں کہ اعتراض کی تنقید سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ سند جو آپ نے لکھی ٹھیک معلوم ہوتی ہے مگر حق بات یہ ہے کہ ابھی میرا اطمینان نہیں ہوا۔ ایک شعر اور تلاش کر لیجئے۔ اسی واسطے تو میں کہا کرتا ہوں گرامی جہانگیری بہار کا آخری پھول ہے جو ذرا دیر کے بعد شاخ سے چھوٹا۔ افسوس کہ آج خان خاناں نہ ہوئے کہ اُن کو معلوم ہوتا کہ خاک پنجاب شیراز و نیشاپور سے کسی طرح کم نہیں"۔

علامہ ۱۷ر فروری ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں۔ غزل لکھنے کا لطف یکجائی میں ہے۔ آپ جالندھر میں، میں لاہور میں غزل کا لطف خاک آئے۔ اس مطلع میں "چناں" کا لفظ مجھے کھٹکتا ہے۔ مگر "بہار رخش" بھی

لطیف نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مطلع ہی لکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک دو شعر اور ذہن میں ہیں ملاحظہ کیجئے۔

زخاک تا بہ فلک ہر چہ ہست رہ پیماست قدم گشائے کہ رفتار کارواں تیزاست

ترجمہ۔ زمین سے فلک تک ہر چیز راہی ہے قدم بڑھاؤ کہ کارواں کی رفتار تیز ہے)

''قدم گشائے'' پر اعتراض ہو تو ''دمے مائیت'' یا ''سبک خرام'' ہو سکتا ہے مجھے تو قدم گشائے ہی خوب معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے''۔

چونکہ تمام نود (۹۰) خطوط جو گرامی کے نام ہیں اُس پر مکمّل بحث نہیں ہو سکتی اس لئے ہم نے ایک ایسا موضوع انتخاب کیا جس میں علامہ کے پانچ خطوط جو چھ ہفتے کے عرصے میں لکھے گئے اور اس (۱۹) اشعار کی نظم جو ''رموز بے خودی'' میں ''فاطمہ زہراؓ تمام مسلمان عورتوں کے لئے اسوۂ کاملہ ہیں'' کے ذیل میں ہیں۔ جو ہمارے مضمون کے موضوع کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں کہ علامہ اقبال غلام قادر گرامی کے شاگرد نہیں بلکہ اُن کے گلشن فکر و فن کے گل چین تھے۔

علامہ اقبال ۱۸ر جون ۱۹۱۷ء کو مولانا گرامی کے خط میں لکھتے ہیں کہ ''آج کل فاطمہ زہراؓ کا مضمون زیر نظر ہے۔ دو شعر لکھے تھے جو ذیل میں عرض کرتا ہوں۔ بہ نظر اصلاح دیکھئے اور رائے سے آگاہ کیجئے۔

بہر محتاجی دلش آنگونہ سوخت با یہودی چادر خود را فروخت

مختش پروردہ ی صبر و رضا آسیا گردان و لب قرآن سرا

دوسرے شعر کا پہلا مصرع کھٹکتا ہے''۔

چونکہ گرامی کے خطوط جو اُنھوں نے اقبال کو لکھے ہمارے دسترس سے خارج ہیں اور ہمارے درمیان موجود نہیں اس لئے ہم صرف قیاس کر سکتے ہیں کہ دوسرے شعر کا پہلا لفظ ''مختش'' کو گرامی نے ''آں ادب'' کر دیا ہوگا کیوں کہ نظم میں اب شعر یوں ہے۔

آں ادب پروردہ یٔ صبر و رضا آسیا گردان ولب قرآن سرا

(یعنی وہ ادب، صبر اور رضا کی آغوش کی پلی تھی جو چکی پیتے وقت بھی قرآن کی تلاوت میں مشغول رہتی تھی)۔ علامہ یکم جولائی ۱۹۱۷ کے خط میں مولانا گرامی کو لکھتے ہیں۔ ''البتہ فاطمہ زہراؑ کے متعلق ایک مضمون ذہن میں آیا ہے یعنی یہ کہ احترام وعزت اگر نسبتوں پر موقوف ہے تو مریم کو صرف ایک نسبت حاصل تھی یہ کہ وہ مسیح کی ماں تھی لیکن فاطمہؑ تین نسبتوں سے محترم ہیں۔

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز　　از سہ نسبت حضرت زہراؑ عزیز
نور چشم رحمت للعالمینؐ　　آن امام اولین و آخرین
آنکہ جان در پیکر گیتی دمید　　روزگار تازہ آئین آفرید
بانوی آن تاجدار ھل اتی　　مرتضیٰؑ مشکل گشاؑ شیر خدا
پادشاہ وکلبہ ئی ایوان او　　یک حسام ویک زرہ سامان او
مادر آں کاروں سالار عشق　　رونق ہنگامۂ بازار عشق (یہ مصرع کھٹکتا ہے)

(ترجمہ۔ اگر مریمؑ ایک نسبت مادر عیسیٰؑ ہونیکی وجہ سے محترم ہے تو حضرت فاطمہؑ تین نسبتوں سے محترم ہیں۔ فاطمہؑ رحمت للعالمینؐ کی نور چشمی ہیں جو اولین اور آخرین امام ہیں۔ جن کی بدولت دنیا بنی اور یہ روزگار اور زندگی خلق کی گئی۔ فاطمہؑ اُن کی ہمسر ہے جس کے سر پر ھل اتی کا تاج ہے جو مرتضیٰؑ مشکل گشاؑ اور شیر خداؑ ہے۔ جو ایسا بادشاہ تھا کہ اس کا چھوٹا سا گھر اس کا ایوان تھا اور ایک تلوار اور ذرہ اس کا سامان تھا۔ فاطمہؑ عشق کے کارواں کے سالار کی ماں ہے جو بازار عشق کے ہنگامے کی رونق تھا)۔

علامہ اقبال کے خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گرامی نے بتایا کہ دونوں مصرعوں میں آخری شعر کے 'مادر' آنا چاہیے چنانچہ اقبال نے آخری شعر یوں کر دیا۔

مادر آن مرکز پرکار عشق　　مادر آں کارواں سالار عشق

علامہ اقبال اپنے تیسرے خط بنام مولانا گرامی ۳ر جولائی ۱۹۱۷ء کو لکھتے ہیں۔ ''میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ اس فکر میں ہوں کہ حضرت سیدہؑ کے متعلق ایک ایسا شعر لکھا جائے جو معانی کے اعتبار سے ایک سو شعر کے برابر ہو۔ آج صبح آنکھ کھلتے ہی ہو شعر ذہن میں آیا ابھی اسے خراد کی ضرورت ہے۔

عرض کرتا ہوں۔

گریۂ شب ہائے آن بالا نشین ہم چو شبنم ریخت بر عرش برین

اِس شعر کو بہ نظر غور فرمائے۔ ''بالانشین'' ''ریختن'' کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے مگر کسی قدر کھٹکتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا گرامی کے مشورے سے اقبال نے اس موضوع کو دو شعروں میں بیان کیا اور پہلے مصرع میں بھی تبدیلی کی۔

گریہ ھای او زبالین بے نیاز گوھر افشاندی بدامان نماز

اشک اور بر چید جبریلؑ از زمین ھمچو شبنم ریخت بر عرش برین

ترجمہ۔ اُس بے نیاز گریہ میں جو آنسو گوہر کہ طرح نماز کی حالت میں اُس کے دامن اور زمین پر گرتے رہے اُسے جبریلؑ نے چنا اور شبنم کے مانند عرش بریں پر بکھیر دیئے۔

علامہ اقبال پھر ۶/جولائی کو مولانا گرامی کے خط میں لکھتے ہیں۔ ''آپ نے جو ترمیم کی وہ بہت بلند ہے۔ بہر حال اِسے سمجھتا ہوں اور چوں کہ آپ نے پیدا کیا ہے اِس کی داد دیتا ہوں۔ چون فاطمہؑ کے متعلق اشعار نظم کر رہا ہوں کیا آپ کو کوئی عمدہ روایت اُن کی طاعت گذاری یا تربیت اولاد کے متعلق یاد ہے جس کو نظم کیا جائے۔ معنی خیز دل گداز روایت ہو تو نظم کرنے میں لطف آتا ہے''۔

علامہ اقبال کا آخری خط اس ذیل میں ۱۶/جولائی ۱۹۱۷ء کا ہے جس میں مولانا گرامی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ''ھاں فاطمہؑ کے متعلق جو اشعار میں نے لکھے تھے اُس کے آخر کے اشعار اس طرح سے ہیں''۔

مادر آن مرکز پرگار عشق مادر آں کاروان سالار عشق

آں یکی شمع شبستان حرم حافظ جمعیت خیر الامم

تانشید آتش پیکار وکین پشت پا زد برسر تاج ونگین

درنوای زندگی سوز از حسینؑ اھل حق حریت آموز از حسینؑ

سیرت فرزندھا از امہات جوھر صدق وصفا از امہات

مزرع تسلیم را حاصل بتولؓ مادران را اسوہ ای کامل بتولؓ

(ترجمہ فاطمہؓ مرکز پرگار عشق اور کاروان سالار عشق کی ماں ہے۔ ایک بیٹا حرم کے شبستان کی شمع جمعیت خیر الامم کا محافظ جس نے تخت وتاج کو ٹھوکر پر مارا۔ زندگی کے نغمہ میں سوز گداز حسینؓ سے ہے۔ اہل حق کے لئے حسینؓ درس آزادی ہے۔ اولاد کی سیرت نگاری اور اُن کی صدق وصفا کے جوہر کی نشونما ماں سے ہے۔ اسلام کی کشت کا ثمر فاطمہؓ ہے اور فاطمہؓ کی زندگی مادران کے لئے اسوۂ کامل اور اسوۂ حسنہ ہے)۔

اقبالؔ ۱۶ر جنوری ۱۹۱۷ء کے خط میں ان اشعار کو لکھنے کے بعد کہتے ہیں۔ ''آپ نے لکھا تھا کہ دونوں مصرعوں میں ''مادر'' کا لفظ ہونا چاہیے۔ معلوم نہیں آپ کے ذہن میں کیا نکتہ تھا جس کے بیان کرنے کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔ میں نے اس اشارے سے فایدہ اٹھایا ہے کہ بعد کے شعر میں حسنؓ و حسینؓ دونوں کا ذکر کر دیا ہے۔ اب ان اشعار کے بعد کا مضمون یہ ہے کہ ایسے بیٹوں سے جن کے یہ اوصاف ہیں ماں کی تربیت کا اندازہ کرنا چاہیے تا کہ معلوم ہو کہ اس ماں کی آغوش میں کیا تاثیر تھی جس میں ایسے بچوں کی پرورش ہوئی۔

علامہ اقبالؔ نے اس نظم کو ان آخری دو اشعار پر ختم کیا۔

رشتہ ی آئین حق زنجیر پاست پاس فرمان جناب مصطفیٰؐ است

ورنہ گرد تربتش گردید مے سجدہ ھا برخاک اور پاشید مے

یعنی اسلام کے آئین کی زنجیر میرے پاؤں میں ہے اور شریعت محمدی کا خیال بھی ہے ورنہ میں فاطمہؓ کی قبر کے طواف میں زندگی بسر کر دیتا اور اُن کی قبر پر تمام عمر سجدے نچھاور کرتا رہتا۔

خلاصهٔ مطالب مثنوی

در تفسیر سورهٔ اخلاص

«قل هو الله احد»

من شبی صدیق را دیدم بخواب — کل ز خاک راه او چیدم بخواب

آن امین الناس، مولای ما — آن کلیم اول سینای ما

همت او کشت ملت را چو ابر — ثانی اسلام و غار و بدر و قبر

گفتمش ای خاصهٔ خاصان عشق — عشق تو سرمطلع دیوان عشق

پخته از دست تو اساس کار ما — چاره‌ئی فرما پی آزار ما

گفت تا کی در هوس گردی اسیر — آب و تاب از سورهٔ اخلاص گیر

ایکه در صد سینه پیچد یک نفس
سرّی از اسرار توحیدست و بس

رنگ او بر کن مثال او شوی
در جهان عکس جمال او شوی

آنکه نام تو مسلمان کرده است
از دوئی سوی یکی آورده است

خویشتن را ترک و افغان خوانده ئی
وای بر تو آنچه بودی مانده ئی

دل رها ن نا میده ا از نا مها
ساز با خم در گذر از جا مها

ای که تو رسوای نام افتاده ئی
از درخت خویش خام افتاده ئی

با یکی ساز از دوئی بر دار رخت
وحدت خود را مکردان بخت بخت

ای ز ستار یکی گر تو توئی
تا کجا با شی سبق خوان دوئی

تو در خود را بخود پوشیده ئی
در دل آور آنچه بر لب چیده ئی

صد ملل از ملتی انگیختی
بر حصار خود شبیخون ریختی

یک شو و توحید را مشهود کن
غائبش را از عمل موجود کن

لذت ایمان فزاید در عمل
مرده آن ایمان که ناید در عمل

«الله الصمد»

گر به الله الصمد دل بسته‌ئی — از حد اسباب بیرون جسته‌ئی

بندهٔ حق بندهٔ اسباب نیست — رند کانی کردش دولاب نیست

مسلم استی بی نیاز از غیر شو — اهل عالم را سراپا خیر شو

پیش منعم سگ‌صفت کردن مکن — دست خویش از آستین بیرون مکن

چون علی در ساز با نان شعیر — کردن مرحب شکن خیبر بگیر

منت از اهل کرم بردن چرا — نشتر لا و نعم خوردن چرا

رزق خود را از کف دونان مگیر — یوسفی خویش را ارزان مگیر

گرچه باشی مور و هم بی بال و پر — حاجتی پیش سلیمانی مبر

راه دشوار است سامان کم بگیر — در جهان آزاد وزی آزاد میر

سبحهٔ اقلل من الدنیا شمار — از نقش حرا شوی خرما بیار

تا توانی کیمیا شو گل مشو — در جهان منعم شو و سائل مشو

ای شناسای مقام بوعلی — جرعه‌ئی آرم ز جام بوعلی

"پشت پا زن تخت کیکاوس را — سر بده از کف مده ناموس را"

خود بخود گردد در میخانه باز — بر تهی پیمانگان بی نیاز

قاید اسلامیان هارون رشید — آنکه نفقور آب تیغ او چشید

گفت مالک اگر ای مولای قوم — روشن از خاک درت سیمای قوم

ای نوا پرداز گلزار حدیث — از تو خواهم درس اسرار حدیث

لعل تا کی پرده بند اندر یمن — خیز و در دار الخلافت خیمه زن

ای خوشا تابانی روز عراق — ای خوشا حسن نظر سوز عراق

میچکد آب خضر از تاک او — مرهم زخم مسیحا خاک او

گفت مالک مصطفی را چاکرم — نیست جز سودای او اندر سرم

من که باشم بسته فتراک او — برنخیزم از حریم پاک او

زنده از تقبیل خاک شیر بم — خوشتر از روز عراق آمد شبم

عشق می گوید که فرمانم پذیر — پادشاهان را بخدمت هم بگیر

تو بسی خواهی مرا آقا شوی — بندهٔ آزاد را مولا شوی

بهر تعلیم تو آیم بر درت — خادم ملت نگردد چاکرت

بهره نی خواهی اگر از علم دین — در میان حلقه درس نشین

بی نیازی نازها دارد بسی — ناز او اندازها دارد بسی

بی نیازی رمز حق پوشیدن است　　رنگ غیر از پیرهن شوئیدن است

علم غیر آموختن اندوختی　　روی خویش از غازه اش افروختی

ارجمندی از شعارش میپری　　من ندانم تو توئی یا دیگری

از نسیمش خاک تو خاموش گشت　　وز گل و ریحان تهی آغوش گشت

کشت خود از دست خود ویران مکن　　از سحابش گدیه باران مکن

عقل تو زنجیری افکار غیر　　در گلوی تو نفس از تار غیر

بر زبانت گفتگوها مستعار　　در دل تو آرزوها مستعار

قمریانت را نواها خواسته　　سروهایت را قباها خواسته

باده می گیری بجام از دست این　　جام هم گیری بوام از دست این

آن نگاهش سر مازاغ البصر　　سوی قوم خویش باز آید اگر

می شناسد شمع او پروانه را　　نیک داند خویش و بیم یگانه را

لست منی گویدت مولای ما

وای ما ای وای ما ای وای ما

زندگانی مثل اخگر تا کجا　　هستی خود در سحر کم تا کجا

ریوی از صبح دروغی خورده‌ئی
رخت از پهنای گردون برده‌ئی

آفتاب استی یکی در خود نگر
از نجوم دیگران تا بے‌خبر

بر دل خود نقش غیر انداختی
خاک بر دی کیمیا در باختی

تا کجا رختی ز تاب دیگران
سر بسنگ ساز از شراب دیگران

تا کجا طوف چراغ محفلی
ز آتش خود سوز اگر داری دلی

چون نظر در پرده‌های خویش باش
می پرو اما بجای خویش باش

در جهان مثل حباب ای بوشمند
راه خلوت خانه بر اغیار بند

فرد فرد آمد که خود را واشناخت
قوم قوم آمد که جز با خود نساخت

از پیام مصطفیٰ آگاه شو
فارغ از ارباب دون الله شو

«لم یلد ولم یولد»

قوم تو از رنگ و خون بالاتر است
قیمت یک اسودش صد حمر است

قطره آب وضوی قنبری
در بها برتر ز خون قیصری

فارغ از ارباب و ام و اعمام باش
همچو سلمان زاده اسلام باش

نکته نی ای همدم فرزانه بین — سهشدرا در خانه های لانه بین

قطره نی از لالهٔ حمرا ستی — قطره نی از نرگس شهلا ستی

این سنے گوید که من از عنبرم — آن نمی گوید من از نیلوفرم

ملت ماشان ابراهیمی است — شهد ما ایمان ابراهیمی است

کرنب را جز و ملت کرده نی — رخنه در کار اخوت کرده نی

در زمین ما نگنجد ریشه ات

هست نامسلم هنوز اندیشه ات

ابن مسعود آن چراغ افروز عشق — جسم و جان او سراپا نور عشق

سوخت از مرگ برادر سینه اش — آب کرد و دید از گذار آینه اش

گریه های خویش را پایان نداد — در غمش چون مادران شیون کشید

ای دریغا آن سبق خوان نیاز — یار من اندر دبستان نیاز

آه آن سر دسهی بالای من — در رو عشق سنے همپای من

"حیف او محروم دربار نبی"

چشم من روشن ز دیدار نبی"

نیست از روم و عرب پیوند ما | نیست پابند نسب پیوند ما
دل به محبوب حجازی بسته‌ایم | زین جهت با یکدگر پیوسته‌ایم
رشتهٔ ما یک تولایش بس است | چشم ما را کیف صهبایش بس است
مستی او تا بخون ما دوید | کهنه را آتش زد و نو آفرید
عشق او سرمایهٔ جمعیت است | همچو خون اندر عروق ملت است
عشق در جان و نسب در پیکر است | رشتهٔ عشق از نسب محکم تر است
عشق ورزی از نسب ما بد گذشت | هم ز ایران و عرب ما بد گذشت
امت او مثل او نور حق است | هستی ما از وجودش مشتق است
«نور حق را کس نجوید زاد و بود | خلعت حق را چه حاجت تار و پود»

هر که پا در بند اقلیم وجد است
بی خبر از لم یلد لم یولد است
«و لم یکن له کفوا احد»

مسلم چشم از جهان بر بسته چیست؟ | فطرت این دل بحق پیوسته چیست؟
لاله‌ای کو بر سر کوهی دمید | گوشهٔ دامان کلچینی ندید

آتش او شعله نی گیرد به بر — از نفس های نخستین سحر
آسمان زآغوش خود نگذاردش — کوکب وا مانده نی پندارد ش

بوسه ش اول شعاع آفتاب
شبنم از چشمش بشوید گرد خواب

رشته نی با لم یکن با بد قوی — تا تو در اقوام بی همتا شوی
آنکه ذاتش واحد است و لاشریک — بنده اش هم در نیاز د با شریک
مؤمن بالای هر بالاتری — غیرت او بر نتابد همسری
خرقهٔ لاتحزنوا اندر برش — انتم الاعلون تاجی بر سرش
می کشد بار دو عالم دوش او — بحر و بر پوردهٔ آغوش او
بر غو تندر مدام افگنده گوش — برق اگر ریزد همی گیرد بدوش
پیش باطل تیغ و پیش حق سپر — امر و نهی او عیار خیر و شر
در کره صد شعله دارد اخگرش — زندگی گیرد کمال از جوهرش
در فضای این جهان های و هو — نغمه پیدا نیست جز تکبیر او
عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم — هم بقهر اندر مزاج او کریم

سازاو در بزم ها خاطره نواز　　سوزاو در رزم ها آهن گداز

در گلستان با عنادل هم صفیر　　در بیابان جبرئه باز صید گیر

زیر گردون می نیاساید دلش　　بر فلک گیرد قرار آب و گلش

طایرش صفقار بر اختر زند　　آنسوی این کهنه چنبر بر زند

تو به پروازی پری نکشوده نی　　کرمک استی زیر خاک آسوده نی

خوار از مهجوری قرآن شدی　　سکوه سنج کردش دوران شدی

ای چو شبنم بر زمین افتنده نی　　در بغل داری کتاب زنده نی

تا کجا در خاک می گیری وطن

رخت بردار و سر گردون فکن